اقبال کی نظم ''رخصت اے بزمِ جہاں''اور ان کی فطرت شناسی

ڈاکٹر محمد محسن

کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ملخص: علامہ اقبال کی نظم ''رخصتِ اے بزمِ جہاں''کا اس مضمون میں تجزیہ کیا گیا ہے اور ان کی فطرت نگاری، منظر نگاری اور کائنات کی دیگر تخلیقات سے ان کی محبت کا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ نظم میں شاعر بزمِ جہاں کو ویرانی سے تعبیر کرتے ہوئے گھبراتے ہیں اور یہاں سے رخصت کا ارادہ باندھنا چاہتے ہیں۔ اس جمِ غفیر سے ان کا دل اس قدر گھبرا گیا ہے کہ وہ ایک ایسی جگہ میں پناہ لینا چاہتے ہیں جہاں سکون کی محفل آراستہ ہو، ندی نالے ہوں، فطری مناظر ہوں، آبشار ہوں اور پہاڑ ہوں۔ درحقیقت اس نظم سے اقبال کی فطرت سے بے پناہ محبت کا اظہار ہوتا ہے اور ان کے جمالیاتی فکر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اقبال, رخصت اے بزمِ جہاں' مناظر فطرت ,آرزو, بانگ درا, نظم , پیغام, نیچر, دامن

اردو سخنوری میں علامہ اقبال کا نام سرِ فہرست ہے۔ وہ نہ صرف ایک عظیم شاعر تھے بلکہ مفکر و فلسفی بھی تھے لیکن فلسفی کی بہ نسبت شاعری میں ان کو امتیازی انفرادیت حاصل ہے۔ جوانی سے ہی ان میں عبادت، تقویٰ وطہارت بدرجۂ اتم پایا جاتا تھا۔ یہی عبادت، تقویٰ وطہارت کا عکس و جھلک ان کی نظموں میں بھی شروع سے دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر بے حد اہم نظمیں لکھی ہیں۔ نظم ''رخصت اے بزمِ جہاں''انھیں میں سے ایک نظم ہے جو مناظرِ فطرت کے موضوع پر علامہ اقبال کی مشہور و مقبول نظم ہے۔ یہ نظم رسالہ 'مخزن' میں شمارہ مارچ 1904ء میں شائع ہوئی تھی۔ جسے علامہ اقبال نے ایمرسن کے کلام سے اخذ کیا ہے۔ اگرچہ یہ نظم علامہ اقبال کی طبع زاد نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے ابتدائی افکار و نظریات کی بہترین ترجمان ہے۔

مندرجہ بالا نظم کے علاوہ بھی بانگ درا میں کئی نظمیں ہیں جن میں مناظرِ فطرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہاں چند کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے مثلاً علامہ اقبال کی ایک نظم جس کا عنوان ''ہمالہ'' ہے۔ اس نظم میں انھوں نے مناظرِ فطرت کی عکاسی کرتے ہوئے جہاں وہ شام کی منظر کشی کر رہے ہیں کہ جب شام کا وقت ہو جاتا ہے تو ماحول پر خاموشی چھا جاتی ہے۔ جس میں آبشاروں کی آواز سنائی دیتی ہے جو نہایت فرحت افزا ہوتی ہے۔ اسی طرح درخت بالکل خاموش کھڑے رہتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھڑے کھڑے کچھ سوچ رہے ہیں اور یہ ایسی خاموشی ہوتی ہے جس پر ہزار تکلم قربان کیے جا سکتے ہیں۔ سورج کے غروب ہونے کے بعد آسمان میں جو شفق نظر آتا ہے اس کی روشنی جب پہاڑ پر پڑتی ہے تو وہ سرخ نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے پہاڑ کے رخسار پر غازہ مل دیا ہے۔

علاوہ ازیں نظم ''گلِ رنگین'' میں گلاب کے پھول کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔اے گلاب کے حسین و جمیل پھول! تجھ میں اور مجھ میں فرق یہ ہے کہ میرے سینے میں ایک ہمہ دم تلاش اور جستجو کرنے والا دل ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرے سینے میں دل ہی نہیں ہے۔ ورنہ تو بھی میری طرح سراپا تلاش و جستجو ہوتا اور میری ہی طرح آرزو میں مبتلا ہوتا اور دردِ الفت کا لذت شناس ہوتا لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تیری زندگی میں نہ کوئی تلاش، نہ کوئی آرزو، نہ ہی جستجو کوئی، نہ ہی تیرے سینے میں کوئی درد اور نہ تو دردِ الفت کا شیدائی ہے۔ جبکہ میں سراپا آرزو بنا ہوا ہوں۔ لیکن گھبراؤ نہیں میں تجھے توڑوں گا نہیں اور نہ تجھے تیرے وطن سے جدا کروں گا کیوں کہ ظاہر ہے کہ چمن تیرا وطن ہے اور وطن سے جدائی تکلیف کا سبب ہوتی ہے اور میں تجھے کسی طرح کی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا بلکہ میں تو عاشقِ فطرت ہوں۔ یعنی قدرتی و فطری حسن کے نظارے سے ہی اپنی آنکھوں کو تسکین کا سامان مہیا کرتا ہوں۔ حسن کے دیدار کے واسطے پھول کو شاخِ گل سے جدا کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ بغیر توڑے بھی حسن کے دیدار سے لذت آشنا ہوا جا سکتا ہے۔ درحقیقت اس نظم میں بھی مناظرِ فطرت کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔

نظم ''ابرِ کہسار'' مناظر فطرت پر ایک معروف نظم ہے جس میں انہوں نے مناظرِ فطرت کو بہت ہی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جو مناظر فطرت پر اس طرح کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ نظم میں ایک جگہ اس کا بیان کمال کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ بادل کے حسن و جمال کو حسین و جمیل عورت سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس طرح عورت کے رُخسار پر جب زلفیں بکھر جاتی ہیں تو وہ بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح جب کالی گھٹائیں آسمان پر بکھر جاتی ہیں وہ بھی نہایت حسین و جمیل معلوم ہوتی ہے اور آسمان کا حسن و جمال دوبالا ہو جاتا ہے۔ بادل کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بادل یوں کہتا ہے کہ یہ میرا ہی فیض ہے کہ جب بارش برساتا ہوں تو کسانوں کو اتنی خوشی ہوتی ہے کہ ان کو اپنی جھونپڑی بھی کسی بادشاہ کی آرام گاہ سے کم معلوم نہیں ہوتی بلکہ ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی بھی شبستانوں کے نمونے پیش کرتی ہے۔

مناظر فطرت کو بیان کرتے ہوئے اپنی مشہور و معروف نظم ''ابر کہسار'' میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کرتے ہیں کہ سرخ گلاب کے اوپر جب بارش کی بوندیں پڑتی ہیں تو وہ منظر دلکش ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سرخ قبا پر موتی جڑ دیئے گئے ہوں۔ جب سرخ رنگ کی قبا میں سفید رنگ کے موتی ٹانک دیئے جاتے ہیں تو قبا کا حسن و جمال دوبالا ہو جاتا ہے جو آنکھوں کو خوب بھاتا ہے اور دیکھنے والوں کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ گرمی کی تپش سے بہت سے پھول مرجھا گئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سو گئے ہیں لیکن جیسے ہی بادل نے بارش برسائی تو ان کے تنِ مردہ میں پھر سے آثارِ حیات نمودار ہوئے اور وہ دوبارہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ پہاڑ کے دامن میں پھرنے والوں نے دامنِ کوہ میں خیمہ لگایا اور وہیں پر قیام پذیر ہو گئے کیونکہ برسات کے موسم میں آبادی سے زیادہ راحت و آرام جنگل اور پہاڑوں میں حاصل ہوتا ہے اور انسانی فطرت یہ ہے کہ جہاں آرام زیادہ میسر ہو اسی جگہ کو وہ اپنا وطن بنا لیتا ہے۔

اسی نوعیت کی ایک اور نظم ''فراق'' ہے جو آبادی پر ویرانے کو ترجیح دینے کے سلسلے میں ہے جس میں شاعر اپنی کیفیت بیان کرتے ہیں کہ محبوب کی جدائی نے مجھے حیران و پریشان کر رکھا ہے۔ دنیا کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں سے اب مجھے کوئی واسطہ نہیں رہ گیا ہے۔ اس لیے میں دامنِ کوہ میں آکر گوشۂ تنہائی میں گوشہ نشین ہو گیا ہوں جہاں مناظرِ فطرت کی دید سے اپنے دل کو بہلاتا ہوں۔ کبھی چشموں کی انتہائی دلکش آواز

سنائی دیتی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چھوٹا سا بچہ جس نے ابھی پوری طرح سے بولنا بھی نہیں سیکھا اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہا ہے۔شام کے وقت جب سورج غروب ہوتا ہے تو پورے آسمان پر شفق چھا جاتی ہے اچانک شام کا ستارہ طلوع ہوتا ہے اور پورے آسمان پر اپنی چمک بکھیر دیتا ہے۔ایسے مناظر نہایت خوبصورت ہوتے ہیں۔جس سے مجھے اپنے محبوب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

بہر حال نظم ''فراق'' اور ''رخصت اے بزمِ جہاں'' میں ایک مقام پر مماثلت ہے کہ جس طرح ''رخصت اے بزمِ جہاں'' میں شاعر آبادی کے شور وغل اور فریب سے پریشان حال ہو کر آبادی کو چھوڑ کر پہاڑ کے دامن میں آباد ہونا چاہتے تھے۔اسی طرح نظم ''فراق'' میں بھی اپنے محبوب کی جدائی کے غم سے حیران وپریشان ہو کر پہاڑ کے دامن میں سکونت اختیار کرنے پر قاصر تھے۔

زیرِ مطالعہ نظم کا موضوع یہ ہے کہ فطرت اور نیچر انسانی زندگی میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔ایک ظاہر پرست انسان دنیاوی چیزوں کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے۔مگر جس شخص کو قدرت دور بین نگاہ اور فراست عطا فرماتی ہے وہ دنیاوی چیزوں کو ویرانے کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتا۔اس کی نگاہ میں یہ تمام چیزیں کچھ حیثیت نہیں رکھتی بلکہ جو چیزیں ایک عام انسان کو کچھ معلوم نہیں ہوتیں وہ ان سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔مناظر قدرت جو بالکل خاموش ہیں مثلاً پہاڑ ،درخت،پرندے، پیڑ پودے، پھل پھول، بہتے دریا،چاند،سورج،رات کی خموشی اور دریا میں موجوں کا اضطراب یہ سب گویا اس کی نظر میں فطرت کے جمال کو بیان کرتی ہیں۔اگرچہ یہ تمام چیزیں خاموش رہتی ہیں مگر قدرت نے ان میں کوئی نہ کوئی پیغام چھپا رکھا ہے جسے وہی شخص سمجھ سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دور اندیشی اور فطری زبان سمجھنے کی صلاحیت عطا کی ہو۔اسی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا کی سیر و تفریح کا حکم دیا ہے اور بہت سی چیزوں کے دیکھنے کی دعوت دی ہے کیونکہ وہ سب چیزیں فطرت اور نیچر کو سمجھنے میں مددگار ہیں۔دنیا کی ہر چیز قدرتِ الٰہی کا مظہر ہے اور اپنے بنانے والے کے وجود اور اس کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔چاہے وہ زمین ہو یا آسمان،چاند ہو یا سورج، بہتے دریا ہوں یا بلند وبالا پہاڑ،دن اور رات کا یکے بعد دیگرے آنا جانا یا موسموں کی تبدیلی۔ایک ہی وقت میں دنیا میں مختلف موسموں کا پایا جانا کہیں سردی ہے تو کہیں گرمی کہیں برسات ہے کہیں گرم ہوا کے تھپیڑے کہیں سورج نکلا ہوا ہے تو کہیں رات ہے۔یہ سب بتاتے ہیں کہ کوئی ہے جو یہ سب کام انجام دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو عجیب وغریب طریقے سے بنایا ہے۔دنیا کے مختلف ممالک میں بہت سی جگہیں نہایت ہی حسین وجمیل ہیں جن کے دیکھنے کی اللہ تعالیٰ نے دعوت دی ہے اور انسانی فطرت بھی تقاضہ کرتی ہے کہ وہ فطرت کے حسین نظاروں کا دیدار کرے اسی فطری تقاضے کے پیش نظر انسان لاکھوں روپیے خرچ کر کے سفر کرتا ہے اور قدرت کے بنائے ہوئے حسین مناظر سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتا ہے۔انسانی زندگی میں فطرت کی بڑی اہمیت ہے چونکہ انسان کی پیدائش فطرت پر ہوئی ہے۔اسی وجہ سے وہ فطری چیزوں سے ہی تسکین حاصل کرتا ہے۔مصنوعی اور بناوٹی چیزوں سے انسان کا دل وقتی طور پر بہل تو جاتا ہے مگر دائمی فرحت ومسرت صرف فطری چیزوں سے حاصل ہوتی ہے۔اس لیے انسانی طبیعت چاہتی ہے کہ دنیا کے ہنگاموں سے دور رہ کر گوشۂ تنہائی میں بیٹھ جائے اور قدرت کے حسین مناظر کا نظارہ کرے اور جو کچھ وہ دیکھے اور سنے اسے اپنی زبان میں لوگوں کو بتائے اور قدرت کا پیغام ان لوگوں کو سنادے جو براہِ راست اسے دیکھ اور سن نہیں سکتے ہیں۔

علامہ اقبال کی یہ نظم تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں نو اشعار ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا اگرچہ آباد معلوم ہوتی ہے مگر جو شخص حقیقت پسند ہوتا ہے اسے ویران معلوم ہوتی ہے۔ ویرانے سے ہر آدمی کا دل گھبراتا ہے۔ کوئی وہاں رہنا نہیں چاہتا بلکہ چاہتا ہے کہ جلد سے جلد یہاں سے رخصت ہو کر اپنے وطن کی طرف روانہ ہو جائے۔ اسی لیے شاعر بھی دنیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے دنیا کی محفلو مجھے اجازت دو اب میں اپنے وطن جانا چاہتا ہوں کیونکہ میرا دل اس ویرانے سے گھبرانے لگا ہے۔ میں رنجیدہ اور غمگیں ہوں اب اس دنیا سے میرا دل اُچاٹ ہو چکا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ میں اس دنیا کے قابل ہوں اور نہ ہی یہ دنیا میرے رہنے کے لائق ہے۔ بادشاہوں کے دربار اور وزیروں کی شان و شوکت محض ایک قید خانہ ہے۔ یہ صرف دیکھنے میں اچھی لگتی ہیں لیکن اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو قید خانے کے سِوا ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ ایسا جال ہے جس میں جکڑ کر انسان اپنی آزادی کھو بیٹھتا اور اپنے جذبات و احساسات کو مار دیتا ہے۔ بادشاہ کی اجازت کے بغیر نہ اٹھ سکتا ہے نہ بیٹھ سکتا ہے اور نہ ہی کہیں جا سکتا ہے۔ غرض کہ ہر کام دوسرے کی مرضی سے ہوتا ہے اپنی کوئی مرضی اور خواہش ہی نہیں۔ جب بادشاہ نے اجازت دی کہ گھر چلے جاؤ تو چلے گئے اور کہہ دیا کہ مت جاؤ تو نہیں گئے۔ یہ غلامی کی حالت سے بھی بدتر ہے۔ لہٰذا بادشاہوں کے دربار میں چاہے کتنی ہی چمک دمک کیوں نہ ہوں لیکن وہ قید خانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے جو آدمی مکار چاپلوس ہوگا وہ تو ایسی زندگی پر راضی ہو سکتا ہے مگر ایک شریف اور خوددار انسان اس طرح کی زندگی جینے پر ہرگز راضی نہیں ہوگا۔ وہ روکھی سوکھی کھالے گا مگر ایسی ذلت و رسوائی اور غلامی کی زندگی کو برداشت نہیں کرے گا۔ وہ آزاد اور عزت کی زندگی بسر کرے گا۔ اگر کبھی امیروں اور بادشاہوں کے دربار میں چلا بھی جاتا ہے تو زیادہ دن نہیں رہ پاتا۔ وہ فقیرانہ زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ کیونکہ عزت دار آدمی کو اپنی عزت زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ روپے پیسے اور سونا چاندی کی چمک دمک اس کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ دنیا کی محفل آرائی اور مجلسی زندگی بڑی پُر لطف ہوتی ہے۔ اس میں وقتی لذت بھی محسوس ہوتی ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ بھری محفل میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں جسے اپنا کہا جا سکے۔ اس لیے اجنبیت سی محسوس ہوتی ہے۔ بظاہر تو ہر شخص سے جان پہچان ہے لیکن اگر ان سے کوئی ضرورت پیش آجائے، کوئی بھی مدد کے لیے تیار نہیں ہوتے گویا وہ سب اجنبی اور بیگانے لگتے ہیں۔ جیسا کہ وہ جانتے ہی نہ ہوں۔ میں نے دنیا کے بڑے لوگوں کی صحبت اختیار کی جو اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے تھے اور دنیا میں بہت عرصہ تک اس طرح بے چینی اور بے قراری میں زندگی گزاری ہے۔ جیسے دریا کی موج ساحل سے ہم کنار ہونے کے لیے بے تاب اور بے چین رہتی ہے۔ دنیاوی عیش و عشرت سے مدتوں میں بھی لطف اندوز ہوا ہوں، خوب مزے اُڑائے ہیں، پُر لطف زندگی بسر کی ہے اور دنیا جو ظلمتوں اور اندھیروں کا گھر ہے اس میں روشنی تلاش کرنے میں ایک عرصہ گزارا ہے۔ دنیا در حقیقت کانٹوں سے بھری ہوئی ہے اور میں اس میں گل کا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔ ظاہر سی بات ہے کہ نہ تو کوئی پھول موجود تھا اور نہ ہی اس کا دیدار ہوا۔ دراصل یہ میرا ہی غلط خیال تھا کہ میں کانٹوں کے بدلے پھول تلاش کرتا رہا لیکن میری دلی خواہش جسے میں حاصل کرنا چاہتا تھا وہ دنیا کے بازار میں حاصل نہ ہو سکا اور میں اس بازار سے ناکام و نامراد ہی واپس لوٹ آیا۔ دنیا سے مایوس اور نامراد ہو کر اب میری حیران و پریشان آنکھیں دوسرے نظاروں کی تلاش میں ہیں۔ دنیا میں بہت تھپیڑے کھائے اب مجھے اپنے ساحلِ مراد پر پہنچ جانے کی آرزو ہے کہ کسی طرح اپنی دلی مراد کو حاصل کر لوں۔ دنیا کے حالات نے بہت ستایا ہے لیکن قلبی مُدعا اب تک حاصل نہ ہو سکا۔ لہٰذا کوئی اور جہاں تلاش کیا جائے جہاں اپنا مقصد حاصل کیا جا سکے۔ میں اس دنیا سے چپ چاپ رخصت ہو جانا چاہتا ہوں جیسے خوشبو پھول کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ کہ اس کا پتہ بھی نہیں چلتا اور وہ چمن سے جدا بھی ہو جاتی ہے۔

ذیل میں پہلے حصے کا ایک شعر پیش ہے۔

چھوڑ کر مانند بو ، تیرا چمن جاتا ہوں میں

رخصت اے بزم جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں

مذکورہ اشعار میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی فرماتے ہیں کہ :

''دنیا شریف اور مخلص اور دیانتدار آدمیوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔اس کے حصول کی صورت مکر و فریب کے علاوہ اور کوئی نہیں چونکہ شریف آدمی نہ خوشامد کرتا ہے نہ ضمیر فروشی نہ مکاری نہ بے ایمانی۔اس لیے اس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ سکوتِ دامنِ کہسار میں گھر بنانے اور انسانوں کے بجائے نرگس، گل ولالہ اور بلبل کی ہمسائیگی اختیار کرلے۔''

(بانگ درا مع شرح، مؤلف پروفیسر یوسف سلیم چشتی۔ص۔176)

مزید ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی مذکورہ بالا شعر کے تعلق سے اپنی رائے اس طرح دیتے ہیں:

''خوشبو اڑ جاتی ہے اسی طرح اے بزمِ جہاں! میں تیرا چمن چھوڑ کر جارہا ہوں۔لہٰذا الوداع! اے بزمِ جہاں! اب میں اپنے وطن کی طرف جارہا ہوں''

(شرح بانگ درا-شارح ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی ص:102)

نظم کا دوسرا حصہ چار اشعار پر مشتمل ہے۔دوسرے حصے میں شاعر نے اپنے اس گھر اور وطن کا تذکرہ کیا ہے جو ان کا محبوب اور ان کی خواہش کے مطابق ہے اور جس کی خاطر انہوں نے دنیا کی ہر خوشی کو الوداع کہا ہے۔فرماتے ہیں کہ میں نے پہاڑ کے دامن میں جہاں بالکل خاموشی کا ماحول ہے وہاں اپنا گھر بنالیا ہے جہاں نہ کوئی انسان ہے اور نہ ہی کوئی شور شرابا ایک دم خاموشی کا عالم ہے اور فطرت کی جلوہ نمائی ہوتی ہے اور مناظرِ قدرت کے مطالعہ کے لیے سب سے بہتر ماحول ہوتا ہے۔دنیا کے شور شرابے کی محفلوں اور لوگوں کی گفتگو میں وہ لذت حاصل نہیں ہوتی جو پہاڑوں کے خاموش ماحول میں حاصل ہوتی ہے۔اب ہر وقت نرگس کی ہمنشینی مجھے حاصل ہے۔گل ولالہ کی صحبت ورفاقت میں میرا وقت گزرتا ہے۔چمن ہی کو میں نے اپنا وطن بنالیا ہے۔لہٰذا چمن کے رہنے والے سب میرے ہمسایہ اور پڑوسی ہیں۔بلبل میری ہمسایہ ہے اس کی میٹھی میٹھی آواز سے لطف اٹھاتا ہوں اور اپنے دل کو مسرت بخشتا ہوں۔جب شام ہوتی ہے اور سونے کا وقت ہوتا ہے تو چشموں کے پانی کی سریلی آواز میرے لیے لوری کا کام دیتی ہے جسے سننے میں بڑا لطف آتا ہے اور میں اسے سنتے سنتے کب نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہوں پتہ ہی نہیں چلتا۔جب صبح ہوتی ہے اور بیدار ہونے کا وقت ہوتا ہے تو میری ہمسایہ کوئل اپنی سریلی آواز سے مجھے بیدار کرتی ہے۔یہ سب مناظرِ فطرت میری طبیعت کو مسرت وخوشی بخشتے ہیں۔سبز فرش میرا بچھونا ہے آسمان میری چھت ہے نہ کوئی گدا ہے نہ تکیہ اور نہ ہی اوڑھنے کے لیے کوئی چادر۔دنیا میں ہر شخص محفلوں

اور مجلسوں کو پسند کرتا ہے۔ لوگوں سے ملنا بات چیت کرنا ہر شخص کو پسند ہے لیکن شاعر کی طبیعت اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہے کہ اس کو گوشۂ تنہائی پسند ہے۔ لوگوں سے ملنا جلنا گپ شپ کرنا ان کی فطرت کو راس نہیں آتا کیونکہ ان کی نظر مظاہر فطرت کے مطالعہ ومشاہدہ میں مشغول رہتی ہے اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ لوگوں سے دور رہا جائے اور کسی گوشے میں تنہائی اور خاموشی کی زندگی گزاری جائے فطرت کی جلوہ نمائی کے لیے اس سے بہتر کوئی ماحول نہیں ہو سکتا۔ بہر حال شاعر فرمارہے ہیں کہ میرا حال دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔ لہٰذا میرا وطن الگ ہے اور دوسرے لوگوں کا وطن الگ ہے لوگ اپنے وطن میں خوش رہیں میں اپنے وطن میں خوش ہوں۔

اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

گھر بنایا ہے سکوتِ دامن کہسار میں
آہ! یہ لذت کہاں موسیقی گفتار میں !
ہمنیشنِ نرگسِ شہلا ، رفیقِ گل ہوں میں
ہے چمن میرا وطن، ہمسایۂ بلبل ہوں میں

نظم کے تیسرے حصے میں آٹھ اشعار درج ہیں۔ اس حصے میں علامہ اقبال فرمارہے ہیں کہ اب میری کیفیت ایسی ہو گئی ہے جو خود مجھے ہی سمجھ میں نہیں آرہی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ پر جنون کی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ آبادی میں ہر شخص رہنا چاہتا ہے لیکن میرا دل آبادی سے گھبراتا ہے اپنی یہ کیفیت دیکھ کر میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ شاید میں بزم قدرت کا پیامی ہوں۔ آخر آبادی کو چھوڑ کر دامنِ کوہ میں میرا آنا کس مقصد سے ہوا ہے۔ کون سی وہ ہستی ہے جس کی تلاش و جستجو مجھے پہاڑ کے دامن میں لے آئی ہے، کس چیز کا مجھے شوق ہے جو مجھے سبزہ پر پھرا رہا ہے اور چشموں کے ساحلوں پر سونے پر آمادہ کر رہا ہے۔ لوگ مجھے طعنہ دیتے ہیں کہ تو گوشۂ تنہائی کا دلدادہ ہو گیا ہے۔ اپنے دوستوں کی محفلوں کو چھوڑ کر اکیلا جنگلوں اور پہاڑوں میں گھومتا پھرتا ہے۔ آخر تجھے یہاں کیا ملتا ہے ؟ کس کی تلاش ہے ؟ تنہائی کی زندگی بسر کرنے کا کیا مقصد ہے ؟ بہت سارے سوالات ہیں جس کا جواب علامہ اقبال آئندہ کلام میں ارشاد فرمارہے ہیں کہ تم غافل ہو، ناواقف ہو، تجھے معلوم نہیں ہے کہ میں نے گوشہ نشینی کیوں اختیار کی ہے۔ غور سے سن، میں قدرت کی اس حسین و جمیل بزم کا پیغام بر اور قاصد ہوں۔ فطرت کا جو پیغام ہے اسے لوگوں تک پہنچانا میرا کام ہے۔ ہر لمحہ قدرتی مناظر کی آواز پر کان دھرے رکھتا ہوں کہ کوئی آواز میرے کان میں پڑے اور اسے لوگوں تک پہنچاؤں۔ میں جو کچھ سنتا ہوں اس کا مقصد صرف یہ نہیں کہ خود سن لیا بلکہ مقصد یہ ہے کہ قدرت کا جو پیغام میں سنوں وہ دوسروں کو بھی سناؤں اور فطرت کے مناظر جو میں دیکھوں وہ دوسروں کو بھی دکھاؤں میرا دیکھنا اور سننا دوسروں کے لیے ہے۔ تاکہ ان کو بھی قدرت کی معرفت حاصل ہو جائے اور فطرت کا خاموش پیغام ان کے دلوں پر دستک دے اور وہ بھی فطرت کے قریب آئیں اور اس کے پیغام کو سمجھیں۔ اے طعنہ دینے والے ! غور سے سن میرا دل تنہائی کا عاشق ہے اور میں اپنی تنہائی پر ہی ناز کرتا ہوں اگرچہ آپ کی نظر میں میرا گھر کوئی حیثیت نہ رکھتا ہو مگر مجھے اپنے اسی گھر پر فخر محسوس ہوتا ہے۔ میری نظر میں یہ گھر اتنا عالیشان ہے کہ دارا و سکندر کے

تخت وتاج بھی اس کے سامنے ہیچ معلوم ہوتے ہیں بلکہ مجھے ان کے ٹھاٹ باٹھ کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے کہ یہ لوگ بھی عجیب وغریب ہیں ان عارضی لذتوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور انہیں کو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ سب چیزیں ایک دن ان سے چھین لی جائیں گی۔ مجھے نہ تخت وتاج چاہئے اور نہ ہی شان وشوکت کی ضرورت ہے۔ میرے لیے تو اتنا کافی ہے کہ زمین پر میرا بستر ہو اور اسی پر لیٹے ہوئے آسمان میں چاند وسورج اور ستاروں کا نظارہ کرتا رہوں۔ رات کو جب کسی درخت کے نیچے لیٹتا ہوں اور تاروں پر نظر پڑتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے میرے اوپر جادو کر دیا ہے۔ ستاروں کو دیکھ کر حیران وششدر رہ جاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان میں بھی ایک خوبصورت دنیا بسا رکھی ہے اور کائنات ارضی کی طرح کائنات سماوی بھی کتنی خوبصورت ہے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر میں مسحور سا ہو جاتا ہوں ہوش ٹھکانے نہیں رہتے، ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے میرے اوپر جادو کر دیا ہے۔ (گل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست وبود!) فطرت کا جو فلسفہ پھول کی ایک پتی سمجھا سکتی ہے وہ سارا فلسفہ اور علم وحکمت بھی مل کر نہیں سمجھا سکتے۔ فطرت کے نظارے اور قدرت الٰہی کی حکمت ومصلحت کو سمجھنے کے لیے محض علم کافی نہیں ہے بلکہ اس کو سمجھنے کے لیے کائنات کی ایک ایک چیز پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم فطرت کے رازوں کو علم کے ذریعہ سمجھنا چاہیں تو ناکام رہیں گے اور فطرت کے راز ہم پر نہیں کھلیں گے۔ اس لیے اس وسیع وعریض کائنات کا مطالعہ ومشاہدہ کیجیے۔ مندرجہ ذیل کے اشعار پر غور فرمائیں۔

ہم وطن شمشاد کا ، قمری کا میں ہمراز ہوں
اس چمن کی خامشی میں گوش بر آواز ہوں
کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لیے
دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لیے

دراصل علامہ اقبال یہاں پیامی شاعر نظر آتے ہیں جو آباد ویرانے پر فطرت کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ آبادی کے شور وغل میں حقائقِ فطرت پر غور وفکر کا وہ موقع میسر نہیں آسکتا جو پہاڑ کے دامن میں رہ کر بخوبی حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ دامنِ کوہ میں خاموشی، شادابی اور آبشاروں کی دلکش اور مدُھر صدائیں ہوتی ہیں۔ وہاں مظاہر قدرت پر غور وخوض کے مواقع بخوبی حاصل ہوتے ہیں اور انسان جب اس حسین وجمیل کائنات کا مطالعہ ومشاہدہ کرتا ہے تو وہ بآسانی ادراک کر سکتا ہے کہ اس حسین وجمیل کائنات کا خالق کوئی قادرِ مطلق ہستی ہے۔ درحقیقت یہ وہی ذاتِ مطلق ہے جو ہم تمام بنی نوعِ انسان کا معبود حقیقی ہے۔ علاوہ ازیں نظم کا اختتام ایک ایسے شعر سے ہوتا ہے جو پوری نظم کا ترجمان ہے۔

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود!
گل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست وبود!

☆☆☆